مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نمبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا اسکے بقایا مضمون ترتیب وار شائع کئے جارہے ہیں

ہو حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کہا جاسکتا ہے کہ :-

حضرت مفتی صاحب مرحوم کی شخصیت ـــــ اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔ کا صحیح مصداق تھی۔ ان کے ذاتی محاسن۔ کمال علم و فضل اور ساتھ ہی بے مثال جذبۂ اخلاص و عمل نے اُن کو بیحد مصروف و مشغول زندگی کے آغوش میں دیدیا تھا۔ اُن کی ہمہ گیر ذمہ داریاں اور دلچسپیاں، اور تھکا دینے والے مشاغل دیکھ کر بسا اوقات ترس آتا تھا۔ صبح سویرے فجر سے اُٹھ کر دیر گئے رات تک وہ احباب و اقارب، آشنا و بیگانہ کے، عوام و خواص کے مختلف معاملات و مسائل میں اس طرح اُلجھے رہتے تھے کہ ان کے شب و روز میں آرام و عافیت کا خانہ کہیں نظر ہی نہ آتا تھا۔ دُور دُور تک پھیلے ہوئے مدارس اور تعلیم گاہیں ہوں یا علم و ادب کی محفلیں۔ سیاسی اور سماجی سرگرمیاں ہوں یا ملّی و دینی اجتماعات۔ سیرت پاک کی کانفرنسیں ہوں یا دینی درسگاہوں کے جلسے اور ختم بخاری شریف کے بابرکت اجتماع ہر جگہ مفتی صاحب کی طلب تھی۔ مانگ تھی۔ ضرورت تھی، اور مفتی صاحب کی بے مثال مُروّت و اخلاق میں سب کے لئے فراخ دِلی تھی اور رواداری۔ وہ اپنی صحت اور آرام کی قیمت پر بھی دوسروں کا دل رکھنا ضروری سمجھتے تھے اس طرح گویا ایک معمول بن گیا تھا کہ وہ دو دن دہلی میں رہتے تو چار دن دہلی سے باہر کسی سفر میں۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مفتی صاحبؒ سینکڑوں دینی مدرسوں، اسکولوں۔ کالجوں۔ دانش گاہوں۔ انجمنوں۔ جماعتوں اور اداروں سے نہ صرف ذمہ دارانہ طور پر وابستہ تھے، بلکہ اپنی بہترین فکری و عملی صلاحیتوں سے اُن کی ساخت و پرداخت میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔

انجمن تعمیر اُردو اور کل ہند انجمن ترقی اُردو کے وہ لائف ممبر تھے اور اُس کی ہر تحریک واقدام میں برابر کے شریک وسہیم۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی بقا و بہبود میں انھوں نے دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یونیورسٹی پچھلے ۲۵ سال میں جس نشیب وفراز اور جن مراحل سے گذری ہے۔ اُس کی تاریخ کے ہر صفحہ پر مفتی صاحب کی سرگرمیوں کے نقوش ثبت ہیں۔ وہ مدتوں یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے۔ اور اس کی فیکلٹی آف دینیات کے تو مستقل ایڈوائزر تھے ـــــ جامعہ ملیہ (دہلی) اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بھی اُن کا گہرا ربط و تعلق تھا۔ اور اُن کی مٹنگوں اور مشوروں میں ہمیشہ شریک رہتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند تو خود اُن کے مادر علمی تھا جس کے آغوش میں اُنکی شخصیت پروان چڑھی تھی۔ عمر بھر وہ مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے۔ اکثر و بیشتر شوریٰ کے جلسوں کی صدارت مفتی صاحب ہی فرماتے تھے۔ دہلی میں بیٹھے ہوئے بھی وہ دارالعلوم کے کتنے ہی اہم کام انجام دیتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ دہلی کی مقامی تعلیم گاہوں ـــ یعنی دہلی کالج۔ اینگلو عربک اسکول۔ فتحپوری مسلم ہائی اسکول۔ شفیق میموریل ہائی اسکول مدرسہ امینیہ۔ جامعہ رحیمیہ۔ مدرسہ عالیہ فتحپوری۔ مدرسہ حسین بخش۔ مدرسہ عبدالرب وغیرہ کو بھی حضرت مفتی صاحب کے قیمتی مشوروں اور گہری دلچسپیوں سے ہمیشہ سہارا ملتا رہا۔ وہ ان تمام درسگاہوں کے رکن و مشیر تھے۔ اور برابر ان کی مٹنگوں میں شریک رہتے تھے۔

دانش کدوں سے اپنے گہرے تعلق کے علاوہ مسلم اوقاف اور حجاج کے معاملات میں بھی مفتی صاحب گہری دلچسپی لیتے تھے۔ مدتوں وہ سنٹرل حج کمیٹی کے رکن رہے۔ جو وزارت خارجہ حکومت ہند کی نگرانی میں حجاج کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے اور ان کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ سنٹرل حج کمیٹی کی مٹنگ میں مفتی صاحب

ہی صدارت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اوقاف کے تحفظ و بہبود سے مفتی صاحب کو گہری دلچسپی تھی۔ سنٹرل وقف کونسل ہو یا دہلی وقف بورڈ، مفتی صاحب کا بہت کچھ وقت ان کے معاملات پر صرف ہوتا تھا۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب۔ میوات، ہریانہ اور دہلی کی بے شمار مساجد۔ درگاہوں اور قبرستانوں کی بربادی۔ ایک مستقل مسئلہ بن گئی تھی۔ ان کی بحالی اور حفاظت کے لئے مرکزی اور مقامی حکومتوں اور سوشل کارکنوں کے ذریعہ بہت کچھ کام کرنے پڑے۔ ان تمام کوششوں میں مفتی صاحب کو بہت کچھ جان کھپانی پڑی۔ آخر عمر تک وہ ان سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ دہلی کا مشہور اور مثالی دارالیتامیٰ (بچوں کا گھر) بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی رہا ہے۔

بیرون ہند اور خاص طور پر مسلم ملکوں سے آنے والے وفود اور معزز مہمانوں کی پذیرائی۔ ہندوستان کے اسلامی و علمی آثار و دوائر سے اُن کو روشناس کرانا۔ دہلی میں مقیم مسلم ممالک کے سفراء کرام کی تقریبات اعیاد و محافل میں شریک رہنا بھی مفتی صاحب کے معمولات کا ایک اہم جزء تھا۔ اور ان تمام حلقوں میں مفتی صاحب کی قدر و قیمت کو برابر ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

آزاد ہند کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو۔ اور ان کے رفقاء وزارت۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ رفیع احمد قدوائی۔ حافظ محمد ابراہیم۔ ہمایوں کبیر۔ شفیع قریشی۔ اور ان کے بعد ہندوستان کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ فخر الدین علی احمد۔ لیڈر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم اور پھر اندرا گاندھی سے مفتی صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ اور اپنی زندگی بھر ان شخصیتوں نے ملک کے اہم ترین معاملات و مسائل میں مفتی صاحب کے اخلاص، بصیرت آموز مشوروں اور رفاقت کار کی پوری اہمیت محسوس کی۔

مفتی صاحب کا سینۂ پُرنور جس طرح علوم دینیہ۔ فقہ اسلامی تفسیر و حدیث کے انوار و برکات سے معمور و منور تھا، اسی طرح وہ زبان و قلم کے بھی شہسوار تھے۔

ان کی تحریر بھی غضب کی شیرینی اور دلآویزی لئے ہوتی تھی۔ اور تقریر بھی نہایت مؤثر، فاضلانہ و دلپذیر۔ وہ بڑی ادا و انداز کے انشاء پرداز بھی تھے اور بے مثال خطیب بھی ندوۃ المصنفین کی شائع کردہ کتنی ہی رفیع تالیفات پر خود مفتی صاحب نے تعارف اور مقدمات تحریر کئے ہیں۔ برہان میں بھی بسا اوقات اداریئے لکھے۔ مختلف موضوعات پر آل انڈیا ریڈیو سے اُن کی جو تقریریں براڈکاسٹ ہوئیں "منارِ صدا" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ سب مفتی صاحب کے قلم کی شگفتہ بیانی اور دلآویزی کی گواہ ہیں۔ اس مجموعہ میں مفتی صاحب کی چند ریڈیائی تقریریں بطور نمونہ شامل اشاعت بھی کی جا رہی ہیں۔ دہلی۔ میرٹھ۔ بھوپال۔ اُجین۔ احمد آباد۔ بڑودہ۔ ناگپور۔ حیدرآباد۔ سورت (گجرات) بمبئی وغیرہ میں مفتی صاحب کی سینکڑوں تقریریں سننے کا اتفاق ہوا۔ سیرت پاک ہو یا ختم بخاری شریف۔ کوئی سیاسی اور سماجی موضوع ہو یا خالص علمی و ادبی عنوان۔ ان کے خزانۂ دل و دماغ سے ہر بار نئے نئے جواہر پارے اُبلتے تھے اور سننے والوں کے سینوں میں اُتر جاتے تھے۔ بلکہ اپنے موضوع سے متعلق نہایت کارآمد۔ جچی تُلی باتیں بڑے ہی مؤثر اور دل نشیں انداز میں پیش کرتے تھے۔ باستثنار محترم مولانا علی میاں مدظلہٗ آج اس پایہ کا کوئی مقرر دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اپنے محاسن و کمالات کے لحاظ سے بلاشبہ اپنے معاصرین میں ان کو صدر نشین کا مقام حاصل تھا۔

آزادیٔ وطن کے بعد جب جمعیۃ علمار کی تحریک پر جب دینی تعلیم کا چرچا ملک بھر میں پھیلا تو سب سے پہلی دینی تعلیمی کانفرنس ۱۹۵۲ء میں احمد آباد میں ہوئی تھی، اس کی صدارت مفتی صاحب ہی نے فرمائی تھی۔ اس کانفرنس میں مفتی صاحب کا خطبۂ صدارت اپنے موضوع پر ایک شاہکار کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے بعد الٰہ آباد میں بھی

تعلیمی کانفرنس کی صدارت مفتی صاحب ہی نے فرمائی۔ پھر ۱۹۵۵ء میں بمبئی کا یادگار اور دُور آفریں کل ہند دینی تعلیمی کنونشن بھی مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی جانفشانیوں ہی کا ثمرہ تھا۔ پھر ٹھیک اسی عروس البلاد میں۔ مفتی صاحب کی۔ قاری محمد طیب صاحب رح اور مولانا حامد الانصاری غازی وغیرہ کی انتھک کوششوں سے ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لار پر وہ کامیاب اور تاریخی اجتماع منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے تمام مسلم زعمار اور مکاتب فکر وحدت کلمہ کے سایۂ میں اپنے پرسنل لار کے تحفظ کے لئے سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے اور مسلم پرسنل لار بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ ملت اسلامیہ ہند کے حال و مستقبل کے حق میں ان عظیم تعمیری اور نتیجہ خیز کوششوں کو پروان چڑھانے میں مفتی صاحب کی بھاگ دوڑ۔ سوجھ بوجھ اور اثر و رسوخ نے بڑا اہم پارٹ ادا کیا۔ اپنے افتادِ طبع و مزاج کے لحاظ سے مفتی صاحب، ہنگامہ و ہٹر لونگ کی بجائے ٹھوس اور تعمیری سرگرمیوں سے ہمیشہ مانوس رہتے تھے اور ایسے ہی کام ان کی دلچسپیوں کا محور ہوتے تھے۔ کشادہ دلی۔ وضعداری۔ خوش خُلقی۔ وسعت نظر اور دُور اندیشی، ان کی فطرت تھی جو ان کے اعمال و کردار میں ہمیشہ نمایاں رہی۔ وہ رسول امن و رحمت صلعم کے وفادار اُمتی اور پیغام رسالتؐ کے راز دار تھے۔ وہ جزئیات و فروعات میں اُمت کی گروہ بندی۔ تحزب اور تنگدلی کے کبھی روادار نہ ہو سکے۔ بلکہ ہمیشہ اُس کے شکوہ مند رہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی ٭ نے برائے فصل کردن آمدی

وہ سچے دل سے یہ چاہتے تھے کہ توحید الٰہی اور رسالت خاتم الانبیار (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھنے والے اُمت مسلمہ کے تمام افراد کم از کم اجتماعی ملی اُمور میں وحدت کلمہ کے جذبہ سے سرشار۔ باہم شیر و شکر اور ایک دوسرے کا دست و بازو بن کر دنیا میں رہیں اور اپنا مقام بلند حاصل کریں۔

اب سے لگ بھگ آٹھ سال پہلے لکھنؤ میں شیعہ، سنی کشمکش نے ۱۹۷۹ء میں بڑی افسوسناک حد تک ہنگامی صورت اختیار کرلی تھی۔ مفتی صاحب بے چین ہوگئے۔ کرنل بشیر حسن صاحب زیدی۔ اور امیر جماعت اسلامی ہند کو ساتھ لے کر لکھنؤ پہونچے اور بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی دیرپا کوشش کرتے رہے۔ اسماعیلی بوہرہ جماعت میں تفریق وانتشار کے فتنوں نے سر اٹھایا تو مفتی صاحب ہی تھے۔ جن کی صلح جوئی اور دلداری نے سب کو سہارا دیا۔ دیوبندی مکتبۂ فکر اور جماعت اسلامی ہند میں افکار ونظریات کا اختلاف بڑھتے بڑھتے جب میدانِ جنگ میں اترنے لگا، تو مفتی صاحب کی دردمندی اور وسعت اخلاق نے فریقین کے بڑھتے ہوئے قدموں کو بتدریج نقطۂ اعتدال تک واپس لوٹنے میں اہم پارٹ ادا کیا۔ واضح رہے کہ مفتی صاحب بجائے خود دیوبندی مکتبۂ فکر کے بڑے ستون تھے اور ان کے پائے ثبات واستقامت میں کبھی لغزش نہ آسکی لیکن ان کی عالی ظرفی اور وسعتِ قلب ونظر نے دلوں کی بیگانگی اور درمیان کے بہت سے مغالطوں کو دور کرنے میں بڑی مدد کی۔ اور خدا خدا کر کے دست وگریبان کا وہ ماحول ختم ہوا۔

مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل

مفتی صاحب مرحوم اور ان کے ہم خیال دوسرے اکابر واعیان کے یہی جذبات تھے جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم کشمکش کی چلتی ہوئی آندھیوں کے مستقل تدارک واصلاح کی تلاش میں "کل ہند مسلم مجلس مشاورت" کی تشکیل (۱۹۶۴ء) کا سبب بنے۔ مجلس کے پہلے صدر انڈین پولیٹکس کے آزمودہ کار بزرگ رہنما اور انڈین نیشنل کانگریس کے رفیق قدیم ڈاکٹر سید محمود منتخب ہوئے۔ اور ان کے بعد تادمِ حیات مفتی صاحب نے نہ صرف اس کی صدارت کا بوجھ سنبھالا، بلکہ راہ کی ہزاروں مشکلات اور رقیبوں کی فتنہ انگیزیوں کے باوجود مجلس کی آواز کو برقرار رکھنے کی کوشش انجام دیتے رہے۔

مجلس مشاورت کی تاسیس کے بعد مرحوم ڈاکٹر سید محمود ۔مفتی صاحب ۔مولانا ابوالحسن علی میاں ۔مولانا ابواللیث ۔پنڈت سندرلال ۔ملا جان محمد سلیمان سیٹھ ۔ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور دوسرے رفقاء مجلس نے جس تندہی ۔دردمندی اور جفاکشی کے ساتھ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۔دہلی ۔یوپی ۔بہار ۔اڑیسہ ۔مدھیہ پردیش ۔راجستھان ۔مہاراشٹر ۔گجرات ۔آندھرا ۔کرناٹک کی خاک چھانی ۔ہندو مسلمان کے دلوں پر دستک دی ۔انسانیت کا سبق یاد دلایا ۔اپنی اثر انگیز تقریروں اور دوروں سے فرقہ وارانہ رواداری اور ہم آہنگی کے جھنڈے لہرائے ۔بلاشبہ ان مخلصانہ کوششوں نے اس حد تک کامیابی حاصل کی کہ تحریک خلافت کا زمانہ لوگوں کو یاد آنے لگا ۔اور جبلپور ۔ساگر ۔کٹنی اور بھرا اور ڈکیلا جمشید پور ۔رانچی ۔احمد آباد ۔بھیونڈی وغیرہ کے ہولناک اور لرزہ خیز مسلم کش فسادات کی جھلسی ہوئی فضاؤں پر ابرِ رحمت کا کام کیا ۔

ان ہی صفحات میں کہیں اور ہم مرحوم ڈاکٹر سید محمود کا وہ خط بھی شریک اشاعت کر رہے ہیں ۔جو انھوں نے ۱۹۶۸ء میں مجلس مشاورت کی صدارت اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتے ہوئے مفتی صاحب کو لکھا تھا ۔ڈاکٹر صاحب کا یہ مکتوب دلسوزی اور ملک و ملت کی خیر اندیشی کا ایک مرقع ہے ۔اور اس میں مجلس مشاورت کی تاسیس ۔اس کے مقاصد اور کارگذاری کا پس منظر بڑے اثر انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔

جمعیۃ علماء ہند میں مفتی صاحب کا رول

علماء ہند کی تنظیم اور جمعیۃ کی تشکیل شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ ،مولانا عبدالباری فرنگی محلی ،مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ ؒ ،مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ اور اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی ۔شیخ الہند کے وصال کے بعد عرصہ تک حضرت مفتی اعظم اُس کے صدر اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ رہے ۔اگلے دور میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی ؒ کو صدر اور

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ ان دنوں ہندوستان کی تحریک آزادی اپنی آخری منزلوں میں تھی اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب بھی ڈابھیل اور کلکتہ سے فارغ ہو کر دہلی آچکے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جمعیۃ کی باگ ڈور سنبھالی تو قدرتی طور پر مفتی صاحب بھی جو مولانا کے لئے حقیقی بھائیوں سے زیادہ تھے۔ جمعیۃ کے ہائی کمانڈ میں شامل ہو گئے۔ اور اس طرح شامل ہوئے کہ پھر دو دہائیوں تک اُن ہی کو جمعیۃ کا فکر و دماغ قرار دیا گیا۔ اور اس دور میں جمعیۃ کی کوئی میٹنگ۔ کوئی اجلاس، کوئی اقدام مفتی صاحب کے بغیر انجام نہ پاسکا۔ جمعیۃ کا ترجمان روزنامہ الجمعیۃ جاری کیا گیا۔ اس کا پریس اور بکڈپو قائم کیا گیا۔ انگریزی ہفت روزہ میسیج نکالا گیا۔ اور خود جماعت کی تبلیغ و تنظیم کا کام دُور دُور تک پھیلا۔ غرض ہر گوشۂ عمل میں مفتی صاحب کے فکر و بصیرت سے جمعیۃ کو بہت کچھ توانائی حاصل ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کی قیامت سروں سے گذری۔ دہلی، پنجاب اور گرد و نواح کی ہولناک بربادیوں کی داستان بہت طویل ہے۔ ان دنوں خود مفتی صاحب کا ادارہ ندوۃ المصنفین اور ان کی ..... رہائش گاہ بھی (قرول باغ۔ دہلی میں) اپنے بیش قیمت علمی اثاثہ کے ساتھ تباہ و برباد ہو گئے۔ پھر مظلوموں کی داد رسی۔ لاکھوں پناہ گزینوں کی تسکین و آباد کاری۔ ان کے لئے وسائل معاش کی فراہمی۔ نکاسی جائیدادوں کا معاملہ اور کسٹوڈین ڈیپارٹمنٹ کی بے پناہ چیرہ دستیوں اور اندھی یلغار سے بے گناہوں کا تحفظ۔ مساجد۔ مزارات اور اوقاف اسلامی کی بحالی اور بازیابی جیسے پیچیدہ اور صبر آزما مسائل کا ایک طوفان تھا۔ جس سے جمعیۃ کے رہنماؤں کو برسوں کبھی سر اُٹھانے کی فرصت نہ مل سکی۔ ہر صبح جواہر لال نہرو۔ مولانا آزاد۔ رفیع احمد قدوائی اور دوسرے ذمہ داروں سے ملنا۔ اور ہر شام کو جمعیۃ کے دفتر میں بیٹھ کر دن بھر کی داستانِ حوادث و مظالم کو سننا اور اُن کی چارہ جوئی کے لئے پھر اگلی صبح دوڑنا۔ برسوں ان بزرگوں کا معمول رہا۔ آج کی کاغذی جمعیۃ کا

صدر سکریٹری اور سب کچھ بننا بچوں کا کھیل ہے۔ مگر وہ بھیانک دور، دودھ پینے والے نہیں، خون جگر کھپانے اور جان پر کھیلنے والے مجنونوں کا طلبگار تھا۔

مجاہد ملت کی وفات اور جمعیۃ کا دم واپسیں

اگست ۱۹۶۲ء میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ زندگی بھر کی تھکن ساتھ لیکر آسودۂ رحمت ہو گئے۔ شیخ الاسلام اور سحبان الہند پہلے ہی واصل بحق ہو چکے تھے۔ اب جمعیۃ کے دامن میں مفتی صاحب کے ہم پلّہ کوئی دوسری شخصیت نہ تھی۔ چنانچہ ملک بھر کے باشعور حلقوں نے جمعیۃ کی قیادت مفتی صاحب کے سپرد کرنے کا دو ٹوک فیصلہ کیا۔ لیکن ایک حلقہ جو بڑے بزرگوں کی قربانیوں اور محنتوں کے پھل چُننے اور اُن کی قیمت دنیا ہی میں حاصل کرنے کے لئے بیتاب و منتظر تھا، اُچھل کر سامنے آگیا۔ اس حلقہ کو یقین تھا کہ مفتی صاحب کی صدارت اور قیادت میں ان کے ڈھکے چھپے مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔ میرٹھ میں جمعیۃ کا اجلاس بلایا گیا جو تقدس کی عبائیں میں لپٹے ہوئے علماء کی باہم آویزش اور تصادم کا ایک مضحکہ خیز ڈرامہ بن کر رہ گیا۔ اس کشمکش اور تلخ کامیوں کا سلسلہ دیر تک قائم رہا۔ مگر مفتی صاحب کی شرافتِ نفس نے اپنے چھوٹوں اور عزیزوں سے اُلجھنا گوارا نہ کیا۔ اور رفتہ رفتہ وہ جمعیۃ سے یکسو ہوتے چلے گئے۔ لیکن ان کے یکسو ہو جانے کے بعد جمعیۃ کی ساکھ اور وقار ہی کیا، خود اُس کے وجود کا جو حشر ہوا اور عوام و خواص کی نظروں میں اس کا جو بھی وزن رہا اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور مفتی صاحب

قصبہ دیوبند میں علوم اسلامیہ و نبویہ کے سدا بہار مرکز انوار و برکات کی تاسیس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ کے ساتھ جن خوش نصیب ہستیوں نے حصہ لیا ان میں سب سے نمایاں مفتی صاحب کے دادا جان حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ تھے۔

اس مقدس مہم میں وہ حضرت نانوتوی کے دست راست اور معتمد رفیق کار تھے۔ پھر پوری صدی تک قاسمی اور عثمانی خاندانوں کی یہ رفاقت کار دارالعلوم کی تاریخ پر سایہ فگن رہی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے ارشاد کے مطابق مفتی صاحب کے والد محترم مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی اپنی آخر عمر تک دارالعلوم کے صفوف علیا کے استاذ اور مفتی اعظم رہے۔ ادھر مولانا رفیع الدین رح کے بعد مفتی صاحب کے چچا جان مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور پھر مولانا شبیر احمد عثمانی رح دارالعلوم کے مہتمم رہے۔ ان کے بعد ہی حضرت قاری محمد طیب صاحب رح نے اہتمام کی پوری ذمہ داری سنبھالی تھی۔ خود مفتی صاحب کی تمامتر تعلیم و تربیت اسی دارالعلوم میں اور دارالعلوم کے بھی خیر القرون میں مکمل ہوئی۔ پھر کئی برس وہ دارالعلوم کے صف اول کے استاذ اور مفتی بھی رہے۔ اور ڈابھیل و کلکتہ سے لوٹنے کے بعد مدت العمر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن صدر نشین رہے۔ اس پس منظر میں آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ دارالعلوم سے ان کو کتنا قلبی تعلق تھا اور اس مرکز علم و انوار الٰہیہ کی ساخت و پرداخت اور فلاح و بہبود انھیں اپنے تمام کاموں سے زیادہ کیوں عزیز تھی۔ دارالعلوم نے جس طرح شفقت و کرم کے ساتھ اپنی آغوش میں پال پوس کر مفتی صاحب کو بنایا تھا، مفتی صاحب نے بھی مدت العمر اس مادر علمی کا حق پہچاننے اور اس کے بنانے سنوارنے میں اپنے مقدور بھر کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

مگر یہ سب تذکرہ ہے اس دارالعلوم کا جو ولی اللہ محدث دہلوی رح اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ارمانوں کا پیکر مجسم تھا جس کی ساخت و پرداخت کے لئے گنگوہی اور نانوتوی پیکروں میں مقدس روحیں اتاری گئی تھیں۔ جو ان بوریہ نشین اللہ والوں کا مسکن و ماوی تھا۔ جن کی راہوں میں فرشتے اپنا دامن بچھاتے تھے۔ جہاں کے چراغوں کی مدھم روشنی سے دیدہ و دل منور ہوتے تھے۔ جہاں کے خس پوش حجروں سے قال اللہ و

قال الرسولؐ کے غلغلے بلند ہوتے تھے۔ زہد و تقویٰ کی لپٹیں اٹھتی اور فضاؤں کو معطر کر دیتی تھیں جہاں سے انوار وحی الٰہی اور علوم نبوت کے چشمے اُبلے اور ان کی موجیں محمود حسن۔ انور شاہ۔ حسین احمد۔ اشرف علی۔ شبیر احمد۔ کفایت اللہ۔ حفظ الرحمٰن۔ بدر عالم۔ یوسف بنوری۔ محمد شفیع۔ عتیق الرحمٰن۔ محمد طیب۔ سعید احمد بنکر دُنیا جہاں تک پھیلیں اور خلق خدا کو سیراب کر گئیں۔

یہ تذکرہ ہے اُس دارالعلوم کا جو درحقیقت صدائے بازگشت تھی۔ غارِ حرا کی مقدس سرگوشیوں کی، گنبدِ خضرا و فاران کی چوٹیوں سے اُٹھنے والی سدا بہار صداؤں کی۔ جس کی پشت تھی حکومت کے خزانوں اور امراء و سلاطین کی داد و دہش کی طرف، اور رُخ تھا استغنار۔ ایثار اور توکل علی اللہ کی طرف۔

آج کے دارالعلوم کا نہیں، جو اپنے منتہائے کمال کو پہونچکر فطرت کے لازوال قانون عروج و زوال کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ گردشِ لیل و نہار کے ہاتھوں جس کی کایا پلٹ ہو چکی ہے اور جو اپنی شاندار بلڈنگوں اور محلاتی چمک دمک کے ساتھ ایک اسٹیٹ بنتا جا رہا ہے۔ اور جہاں جاکر آج قرآن حکیم کے بتائے ہوئے اس درسِ عبرت و موعظت کا پورا پورا مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ "إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ۔

جہاں تیزی سے اسلاف کے آثار و نشانات مٹانے کی مہم بر پا ہے ——— اور آرڈر یہ ہے کہ ع :۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔

فخلف من بعدهم خلف اضاعوا الصلاة واتبعوا الشهوات۔

اتفاق کی بات ہے کہ دارالعلوم کے اس نئے ہنگامی دور میں اسلاف کی روایات کی امین اور یادگار دو ہی شخصیتیں رہ گئی تھیں۔ قاری محمد طیب صاحب ، اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ——— انقلاب کی سرکوبی شِ و یلغار کا نشانہ ان ہی کو